© rasailojaraid.com

نفاذ شریعت - سیاسی وسماجی اثرات

خورشید احمد ندیم

پاکستان میں نفاذ شریعت کا عنوان بالعموم ریاست کی اسلامی تشکیل، قانون سازی اور اجتماعی وسیاسی امور میں شریعت کی بالادستی جیسے موضوعات کے لیے مستعمل ہے۔ اسے ہماری مذہبی سیاسی جماعتوں نے ایک مطالبے کے طور پر ہر حکومت کے سامنے رکھا ہے اور اس مقصد کے لیے جو تحریکیں اٹھائی گئی ہیں، ان کا ہدف بھی حکومتیں ہی رہی ہیں۔ اس باب میں قائد اور راہنما کی حیثیت جماعت اسلامی کو حاصل ہے۔ برصغیر میں انگریزوں کی آمد کے بعد احیائے ملت کے لیے جو آوازیں اٹھیں، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد پہلی آواز ہیں جو حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے تھی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک منظّم اجتماعی کوشش کا آغاز کیا اور حزب اللہ کے نام سے ایک جماعت بنائی۔ بطور ایک مصنف، عالم اور انشاپرداز کے، انہیں اگرچہ مسلمان حلقوں میں بہت پذیرائی ملی لیکن ان کے تصور حکومت الٰہیہ کو مسلمانوں کا عملی تعاون میسر نہ آسکا اور وہ اس کوشش سے عملاً دست بردار ہو کر آزادی کی قومی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔ اس کے لیے انہوں نے کانگریس کے پیٹ فارم کا انتخاب کیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ان معنوں میں مولانا آزاد کے جانشین ہیں کہ انہوں نے برصغیر میں حکومت الٰہیہ کے تصور کا احیا کیا اور اس کے لیے جماعت اسلامی کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ یہ جماعت ۱۹۴۱ء میں بنی اور اس کا مقصد ہندوستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا تھا۔ اپنے اسی اصولی موقف کی بناء پر مولانا مودودی تحریک پاکستان کو بھی ایک ''وقتی مسئلہ'' سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اس نوعیت کے مسائل پر وقت ضائع کرنے کی بجائے زیادہ اہم تھا کہ ایک مکمل اسلامی انقلاب کے لیے جدوجہد کی جائے۔ جماعت اسلامی کے تاسیسی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں کہا:

''ہمارے لیے چونکہ خود اسلام ہی تحریک ہے اور اسلام کی دعوت تمام دنیا کے انسانوں کے لیے ہے، لہٰذا ہماری نظر کسی خاص قوم یا کسی خاص ملک کے مخصوص وقتی مسائل میں الجھی ہوئی نہیں ہے بلکہ پوری نوع انسانی اور ساری کرہ زمین تک وسیع ہے''۔

تقسیم ہند کے بعد مولانا مودودی نے پاکستان کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور یہاں جماعت اسلامی پاکستان کو منظّم کیا۔ جماعت کا نصب العین اس کے دستور میں، ان الفاظ میں درج ہے:

''جماعت اسلامی پاکستان کا نصب العین اور اس کی تمام سعی وجہد کا مقصد عملاً اقامت دین (حکومت الٰہیہ یا اسلامی نظامِ زندگی کا قیام) اور حقیقتاً رضائے الٰہی اور فلاح اخروی کا حصول ہے''۔

دستور میں اس نصب العین کی وضاحت میں کہا گیا ہے:

''الدین، حکومت الٰہیہ اور اسلامی نظامِ زندگی اس جماعت کی اصطلاح میں ہم معنی الفاظ ہیں''۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قیام پاکستان کے فوراً بعد جماعت اسلامی نے اپنی توجہ اس نکتے پر مرتکز کردی کہ پاکستان کا آئین اور دستور اسلامی ہونا چاہیے۔ جماعت کے چار نکاتی مطالبہ دستور اسلامی میں یہ شامل تھا کہ پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہو اور شریعت کے خلاف موجود تمام قوانین منسوخ کیے جائیں۔ ۱۲؍ مارچ ۱۹۴۹ء کو دستور ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد منظور کرلی۔ اس کے لیے اسمبلی کے اندر مولانا شبیر احمد عثمانی نے کردار ادا کیا اور عوامی سطح پر جماعت اسلامی نے۔ اس قرارداد کی منظوری جماعت کے نزدیک ریاست کے کلمہ پڑھنے کے مترادف تھی۔ روایتی علما اگرچہ قومی سیاست میں قیام پاکستان سے پہلے ہی ایک حد تک سرگرم تھے لیکن ان کی اس جدوجہد کا تعلق کسی اسلامی ریاست کے قیام سے نہیں تھا۔ جمعیت علمائے ہند نے قومی آزادی کی جنگ میں کانگریس کا ساتھ دیا اور بریلوی علما نے سنی کانفرنس کے پلیٹ فارم سے مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ قیام پاکستان کے بعد ابتداً ان لوگوں کی دلچسپی ریاستی سے زیادہ مسلکی امور سے رہی اور وہ قومی سطح پر مذہبی معاملات ہی کے لیے سرگرم رہے۔ جماعت اسلامی نے جب مطالبہ دستور اسلامی اٹھایا تو دیگر علما سے بھی رابطہ کیا۔ چنانچہ ۲۱ تا ۲۴؍ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو کراچی میں مختلف مکاتب فکر کے علما کا ایک کنونشن منعقد ہوا جس میں معروف بائیس نکات ترتیب دیئے گئے اور حکومت سے کہا گیا کہ وہ ان نکات کی روشنی میں دستور بنائے تاہم ان علماء نے اس مقصد کے لیے کوئی عوامی تحریک برپا نہیں کی۔

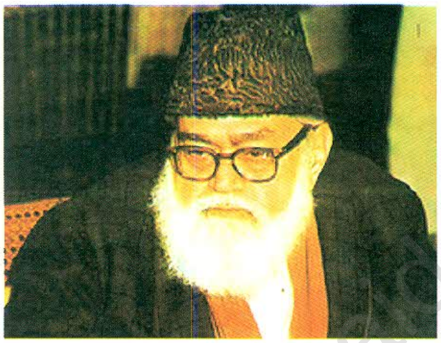

۱۹۵۳ء میں احرار نے قادیانیوں کے خلاف ایک تحریک اٹھادی۔ جماعت اسلامی کسی ایسی تحریک کے حق میں نہیں تھی۔ اس کا موقف یہ تھا کہ اگر اس کا مطالبہ دستور اسلامی مان لیا جاتا ہے تو یہ مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ تاہم اس وقت فضا کچھ ایسی بن چکی تھی کہ جماعت کے لیے اس سے الگ رہنا ممکن نہ ہوسکا اور اس نے اپنے آٹھ نکات میں قادیانیت کے مسئلہ کو ''نکتہ نو'' کے طور پر شامل کرلیا۔ علما کی جدوجہد جو زیادہ مسلکی بقا اور دعوت وارشاد کے دائرے تک محدود تھی، اب اس میں سیاست کا عنصر بھی داخل ہوگیا اور ''اسلامی انقلاب'' یا ''حکومت الٰہیہ'' جیسی اصطلاحیں جو اس سے پہلے جماعتی حلقوں تک محدود تھیں، اب تمام مذہبی سیاسی جماعتیں انہیں بلاتکلف استعمال کرتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جماعت اسلامی نے بڑی حد تک ریاستی وسیاسی امور کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھا لیکن وہ نظری طور پر ایک تین نکاتی پروگرام کی علمبردار رہی جس میں لوگوں کی مذہبی وسیاسی تنظیم بھی شامل تھی، جس کا مقصد لوگوں کو اسلامی انقلاب کے لیے تیار کرنا ہے۔ دوسری طرف دیگر سیاسی مذہبی جماعتیں اگرچہ سیاست میں پوری طرح فعال رہیں لیکن انہوں نے سیاسی جماعت کے لیے اپنی اپنی مذہبی عصبیتوں کو بنیاد بنایا مثال کے طور پر جمعیت علمائے اسلام جو دیوبندی

مسلک سے تعلق رکھتی ہے، اس نے ۱۹۷۰ء میں انتخابات کے لیے جو منشور پیش کیا، اس میں ایک طرف علما کے ۲۲ نکات کو دستور کی بنیاد قرار دیا اور دوسری طرف یہ بھی کہا کہ صدر اور وزیر اعظم کے لیے مسلمان ہونے کے علاوہ اہل سنت سے ہونا بھی ضروری ہوگا۔ جمعیت علمائے پاکستان، جس کا تعلق بریلوی مسلک سے ہے اس نے اپنے منشور میں یہ واضح کیا کہ قرآن مجید یا اسلام کی کوئی تعبیر قابل قبول نہیں ہوگی جو فقہ حنفی سے انحراف کرکے پیش کی جائے گی۔ ان مذہبی جماعتوں نے سیاسی اتحاد بنا کر بھی انتخابات میں حصہ لیا اور ایک مرحلے پر ۲۰۰۳ء میں وہ صوبہ سرحد میں حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس سے قبل ۱۹۱۰ء کی دھائی میں جمعیت علمائے اسلام، اس وقت کی قوم پرست جماعت نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ مل کر کچھ عرصہ کے لیے صوبہ سرحد میں وزارت اعلیٰ کے منصب تک پہنچنے میں کامیاب رہی تھی۔ جماعت اسلامی نے کراچی میں بلدیاتی انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ تاہم قومی سیاست میں ان کے کردار میں ایک یکسانیت رہی اور وہ ایک خاص حد سے زیادہ نہ بڑھ سکا۔

نفاذ شریعت کی اس جدوجہد کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو اس کے نتائج کچھ اس طرح ہمارے سامنے آتے ہیں۔

۱- دستوری سطح پر یہ جدوجہد اس طرح کامیاب رہی کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کی رو سے اب پاکستان میں قرآن وسنت کے خلاف قانون سازی نہیں ہوسکتی اور اگر کوئی شہری یہ سمجھتا ہے کہ ملک کا کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف ہے تو وہ اسے عدالت میں چیلنج کرسکتا ہے۔

۲- روایتی مذہبی جماعتوں کے فہم دین کے مطابق ملک میں حدود اور قصاص ودیت کے قوانین نافذ ہوچکے ہیں۔

۳- کوئی سیاسی حکومت دینی امور میں ان جماعتوں کے دباؤ کے پیش نظر، کوئی دوسری تعبیر اختیار کرنے پر آمادہ نہیں۔

۴- سیاست میں مذہبی جماعتوں کے اثر ورسوخ میں اضافہ ہوا۔

اس کے ساتھ بعض دوسرے نتائج ایسے ہیں، جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر

۱- اگر نفاذ شریعت کا تعلق قانون سازی کے باب سے ہے تو اب اس میں کسی مزید اضافے کا امکان نہیں، لہٰذا اس عنوان سے کوئی تحریک یا جدوجہد غیر ضروری ہوگی۔

۲- قانون سازی کے حوالے سے ہر ممکن قدم اٹھانے کے باوجود معاشرے کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مجموعی اسلامی واخلاقی ساخت میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں آئی۔معاشرہ آج سے ساٹھ برس قبل جتنا مسلمان تھا، آج بھی اتنا ہی مسلمان ہے۔

۳- سیاسی جماعتوں کے اثر ورسوخ میں اتنا اضافہ تو ہوا کہ انہوں نے مذہبی معاملات میں بڑی سیاسی جماعتوں کو آزادانہ سوچ اپنانے سے روکا لیکن اس کے ساتھ وہ اس قابل نہ ہوسکیں کہ قوم انہیں اپنی سیاسی قیادت کے مستحق سمجھیں۔بے نظیر بھٹو صاحبہ کے خلاف یہ مذہبی ہتھیار بھی استعمال ہوا کہ ''اسلام میں عورت کی حکمرانی جائز نہیں''لیکن اس کے باوجود عوام نے انہیں دومرتبہ منصب حکومت تک پہنچایا۔

۴- مذہبی جماعتوں نے اپنے سیاسی رسوخ میں اضافے کے لیے ہر ریاستی واجتماعی معاملے کو مذہبی بنانے کی کوشش کی، جس سے معاشرے پر دوررس اثرات مرتب ہوئے، جن میں سے بدقسمتی سے اکثر منفی تھے۔مثال کے طور بر ہفتہ روزہ چھٹی جمعہ کو ہونی چاہیئے یا اتوار کو۔اسی طرح یہ معاملہ کہ پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ ہونا چاہیئے یا نہیں، اصلاً انتظامی معاملات ہیں لیکن جب ان غیر مذہبی معاملات کو زبردستی مذہبی بنایا گیا تو اس کے لیے ان کی مذہبی تعبیر تلاش کی گئی اور یوں مذہبی احکامات میں ایک نوعیت کی تبدیلی کی گئی۔ اسی طرح افغانستان میں روسی مداخلت کے خلاف جو جدوجہد ہوئی، اسے ایک مذہبی عمل بنانے کے لیے اس پر جہاد کے تمام احکام منطبق کیے گئے۔غیر ریاستی سطح پر عسکری سرگرمیوں کو مذہبی استدلال فراہم کیا گیا۔اس کے نتیجے میں ہمارا معاشرہ شکست وریخت کے جس عمل سے گزرا، آج ہم بچشم سر اس کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔

۵- معاشرے کی اسلامی تشکیل کے لیے اس نقطہ نظر پر نظر ثانی کی ضرورت ہے کہ اس کا آغاز قانون سازی سے ہونا چاہیے۔اس سوال پر غور کرنا چاہیے کہ جس معاشرے میں معاشی استحصال عام ہو، طبقاتی تقسیم موجود ہو اور تعلیم کا فقدان ہو، کیا وہاں محض قانون سازی سے کوئی تبدیلی ممکن ہے؟ یعنی سماجی ومعاشرتی اصلاحات کے بغیر محض عقیدے کی بنیاد پر کیا کوئی معاشرہ تبدیل ہوسکتا ہے؟

۶- ملک میں ۲۷ برس تک حدود قوانین نافذ رہنے کے باوجود کسی ایک ملزم کو ان قوانین کے تحت مجرم ثابت نہ کیا جاسکا۔ اسی طرح ان قوانین کی موجودگی میں بھی معاشرے کی اخلاقی ساکھ میں کوئی مثبت تبدیلی نہیں آئی بلکہ مذہبی پیمانے سے شاید ابتری میں اضافہ ہوا ہے۔کیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم شرعی قوانین جرم وسزا کے اپنے قدیم فہم پر نظر ثانی کریں جس سے یہ قوانین ماخوذ ہیں۔

یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ مذہبی عناصر کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ گذشتہ ساٹھ سال میں معاشرے کی نظری ساخت کو اشتراکی یا سیکولر بنانے کی بھی منظّم کوشش ہوئی لیکن میرے نزدیک ایسی کسی کوشش کو پذیرائی نہ مل سکی۔ میرا تاثر ہے کہ اس سماج کو ایک خاص حد سے زیادہ سیکولر بنایا جاسکتا ہے نہ مذہبی۔ ہر معاشرے میں ایک فطری عمل کے تحت سماجی ارتقاء کا عمل جاری رہتا ہے جس کے تحت مختلف خیالات کی ترویج واشاعت ہوتی رہتی ہے اور معاشرہ ردوقبولیت کا فیصلہ اپنی ضروریات کے تحت کرتا ہے۔جس معاملے پر توجہ کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ معاشرہ اپنی ساخت میں جمہوری ہو جہاں مختلف نقطہ ہائے نظر پیش کرنے کی اجازت ہو اور کوئی تصور بزور منوانے کی کوشش نہ کی جائے۔ جو لوگ عوام کی مذہبی تربیت کرنا چاہتے ہیں انہیں دعوتی سرگرمیوں کی اجازت ہو اور اس کے لیے ماحول سازگار ہو۔ اسی طرح جو لوگ ریاست کی کسی خاص مفہوم میں نظری تشکیل کے خواہش مند ہوں، ان کا بھی یہ حق تسلیم کیا جائے کہ وہ مروجہ جمہوری روایات کے مطابق اپنی بات کہتے رہیں۔ پاکستان میں نفاذ شریعت کے لیے ہونے والی جدوجہد سے میرا خیال ہے کہ یہ تاثر پختہ ہوجاتا ہے کہ یہ معاشرہ ہماری مذہبی جماعتوں کی تعبیر کے مطابق مذہبی نہیں ہوسکتا۔ان کا پر امن دعوت کا حق بجا لیکن اس سماجی حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تو انہیں اپنی حکمتِ عملی پر نظر ثانی کرنا پڑے گی۔

© rasailojaraid.com